© rasailojaraid.com

امام ابوالحسن الاشعریؒ کا دینی فلسفہ

عبدالستار انصاری
اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ تاریخ اسلام جامعہ سندھ
جامشورو

آخری قسط

حقیقت یہ ہے کہ اس مسئلہ میں بھی امام الاشعری نے ایک درمیانی راہ اختیار کی ہے اس لیے کہ معتزلہ جو قرآن کو مخلوق کہتے ہیں) کے برخلاف حشویہ کہتے ہیں کہ حروف مقطعات، قرآن کے اوراق وہ روشنائی جس سے قرآنی الفاظ لکھے جاتے ہیں غرض یہ کہ ہر ایک چیز غیر مخلوق ہے مگر امام صاحب نے اس سلسلے میں اپنا مسلک اس طرح واضح کیا۔

"القرآن کلام اللہ قدیم غیر مغیر ولا مخلوق ولا حادث ولا مبتدع فاما الحروف المقطعة ولاجسام والالوان والاصوات والمحدودات وکل مافی العالم من المکیفات مخلوق مبتدع مخترع"[۲]

یعنی قرآن خدا کا کلام ہے، قدیم ہے نہ اس میں تبدیلی کا امکان ہے نہ یہ مخلوق ہے اور نہ حادث اور نہ جدید، البتہ حروف مقطعات، قرآن کے اوراق الوان واصوات مخلوق ہیں اور جدید ہیں۔

اشاعرہ کے نزدیک قرآن خدا کے اندر ابدی تھا مگر الفاظ و جملوں کا ادا ہونا زمانے میں ہوا ہے اور یہ مخلوق ہے اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ الفاظ و جملوں میں قرآن کا اظہار نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

---

[۲] تبیین کذب المفتری ص۱۵۰

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

امام ابوالحسن الاشعریؒ کا دینی فلسفہ

عبدالستار انصاری
اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ تاریخ اسلام جامعہ سندھ
جامشورو

آخری قسط

حقیقت یہ ہے کہ اس مسئلہ میں بھی امام الاشعری نے ایک درمیانی راہ اختیار کی ہے اس لیے کہ معتزلہ جو قرآن کو مخلوق کہتے ہیں) کے برخلاف حشویہ کہتے ہیں کہ حروف مقطعات، قرآن کے اوراق وہ روشنائی جس سے قرآنی الفاظ لکھے جاتے ہیں غرض یہ کہ ہر ایک چیز غیر مخلوق ہے مگر امام صاحب نے اس سلسلے میں اپنا مسلک اس طرح واضح کیا۔

"القرآن کلام اللّٰہ قدیم غیر مغیر ولا مخلوق ولا حادث ولا مبتدع فاما الحروف المقطعۃ ولاجسام والالوان والاصوات والمحدودات وکل مافی العالم من المکیفات مخلوق مبتدع مخترع"[۱]

یعنی قرآن خدا کا کلام ہے، قدیم ہے نہ اس میں تبدیلی کا امکان ہے نہ یہ مخلوق ہے اور نہ حادث اور نہ جدید، البتہ حروف مقطعات، قرآن کے اوراق الوان واصوات مخلوق ہیں اور جدید ہیں۔

اشاعرہ کے نزدیک قرآن خدا کے اندر ابدی تھا مگر الفاظ و جملوں کا ادا ہونا زمانے میں ہوا ہے اور یہ مخلوق ہے اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ الفاظ و جملوں میں قرآن کا اظہار نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

---

[۱] تبیین کذب المفتری ص۱۵۰

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پر مبنی ہے جس پر یہ نازل ہوا۔ بلکہ یہ بھی خدا کے ہیں اور نہ ہی یہ مطلب ہے کہ قرآن بر وقتِ وحی پیدا کیا گیا بلکہ یہ اس سے بہت پہلے اس وقت مخلوق ہوا تھا جب پہلے پہل ملائکہ اور برگزیدہ ہستیوں کو بتایا گیا تھا اور بعد میں حضرت جبرئیل اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ظاہر کیا۔ آج بھی اہل سنت کا یہی عقیدہ ہے چنانچہ امام احمد بن حنبلؒ کی استقامت اور امام ابوالحسن الاشعریؒ کے استدلال کے باعث خلق قرآن کا عقیدہ مسلمانوں میں مقبولیت حاصل نہ کرسکا اور دنیا عالم کے مسلمانوں کا آج بھی یہی عقیدہ ہے کہ قرآن مخلوق وحادث نہیں۔

۳ مسئلہ امکان رؤیت باری تعالیٰ

اشاعرہ رؤیت باری تعالیٰ کے قائل تھے اور ان کا عقیدہ تھا کہ خدا کا دیدار دنیا میں ممکن اور آخرت میں یقینی ہے مگر اس کی صورت وکیفیت سے ہم ناآشنا ہیں[۱]۔ اس کے برعکس معتزلہ اس کے منکر تھے اس لیے کہ ان کے نزدیک رؤیت باری تعالیٰ کو تسلیم کرنے سے تجسیم لازم آتی ہے کیونکہ شے مرئی کے لیے ضروری ہے کہ وہ جسم ہو اور ایک خاص جہت اور مکان میں واقع ہو تاکہ نظر و بصر کے احاطہ میں آسکے اور ظاہر ہے کہ ذات باری تجسیم و جہت و محاذات سے پاک ہے۔

معتزلہ اس سلسلے میں قرآن کی اس آیت سے استدلال کرتے ہیں:

"لا تدرکہ الابصار وھو یدرک الابصار"[۲] یعنی نگاہیں اس کا ادراک نہیں کرسکتیں اور وہ نگاہوں کا ادراک کرسکتا ہے۔

امام الاشعریؒ نے معتزلہ کے اس نظریہ کا بہت سے دلائل کے ساتھ رد کیا ہے۔ ان کے نزدیک معتزلہ کی اصل گمراہی یہ ہے کہ وہ نصوص قرآن کی غلط تاویل کرتے ہیں چنانچہ آپ فرماتے ہیں کہ:

"فان من الزائغین عن الحق من المعتزلة واھل القدر مالت بھم اھواؤھم الی تقلید رؤسائھم ومن مضی من اسلافھم فتأولوا القرآن علی آرائھم تاویلا لم ینزل اللہ بہ سلطانہ ولا اوضح بہ برھانا۔ ولا نقلوہ عن رسول رب العالمین

---

[۱] اردو دائرۃ المعارف اسلامیہ ج ۲ ص ۷۹۹۔ [۲] سورت الانعام آیۃ ص ۱۰۳۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ولا عن السلف المتقدمین وخالفوا روایات الصحابة علیهم السلام عن نبی الله صلوات الله علیه فی رؤیة الله عز وجل بالابصار وقد جاءت فی ذالک الروایات من الجهات المختلفات وتواترت بها الآثار۔[1]

یعنی بہت سے معتزلہ اور قدریہ اپنی خواہشات کی بناء پر اپنے پیش رو اکابر کی تقلید کرتے ہیں۔ وہ قرآنی آیات کی تاویل وتفسیر اس انداز سے کرتے ہیں کہ نہ خدا نے اس کا ذکر کیا نہ اس کی حجت و برہان واضح کی۔ نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول اور نہ سلف صالحین سے مذکور ہے صحابہ کرامؓ نے رؤیت بالابصار کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جو روایات نقل کی ہیں۔ معتزلہ اس کو تسلیم نہیں کرتے حالانکہ یہ روایات مختلف الجہات اور متواتر ہیں۔

جیساکہ معتزلہ نے "لاتدرکه الابصار" کی غلط تاویل وتفسیر سے ادراک کی نفی کا مفہوم نکالا ہے۔ امام الاشعریؒ اس کے جواب میں لکھتے ہیں کہ اس کا صاف صاف مفہوم یہ ہے کہ دنیا میں ابصار کے ذریعے ادراک نہیں ہوسکتا۔ البتہ آخرت میں ضرور ہوسکتا ہے۔ ہاں! کفر کرنے والوں کے لیے بے شک آخرت میں بھی یہ ناممکن ہے۔[2]

اس کے بعد معتزلہ کا رد عقلی استدلال سے فرماتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ادراک بصری رائی کے ساتھ قائم ہوتا ہے۔ وہ مرئی کے ساتھ اتصال شعاع کا مستدعی نہیں ہوتا، نہ رائی کے ساتھ کسی چیز کے انفصال کا طالب ہوتا ہے پس جب تاثیر اور تاثر دونوں باطل ہوگئے تو رؤیت بایں طور جائز ہوگی کہ نہ تشبیہ واجب رہی، نہ حقیقت سے انقلاب، اور یہ معنی ایسے ہوگئے، جیسے علم ہا جنس ہے جس کا مساوی طور پر موجود اور غائب سے رشتہ قائم ہوتا ہے، اور جس کے لیے نہ تاثر واجب ہے نہ تاثیر[3]

حقیقت یہ ہے کہ رؤیت باری تعالیٰ کے مسئلہ میں تمام اہل سنت متفق ہیں۔ امام احمد بن حنبلؒ علی المدینیؒ، اسحٰق بن ابراہیم، داؤد بن علی، امام دارمی اور محمد بن اسحٰق جیسے جلیل القدر ائمہ نے اس کی تائید کی ہے اس اعتقاد کی بنیاد وہ اساس قرآن کی یہ آیت قرار دی ہے۔

---

[1] کتاب الابانہ ص۲-۳ [2] کتاب الابانہ ص۱۳

[3] کتاب الابانہ عن اصول الدیانہ ص۱۶۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

"وجوہ یومئذ ناضرۃ الی ربہا ناظرۃ"[1] یعنی اس روز بہت سے چہرے بارونق ہوں گے جو اپنے رب کے دیدار میں محو ہوں گے۔

اور خدا کا یہ دیدار کس طرح ہوگا اس کا ذکر احادیث مبارکہ میں موجود ہے بخاری شریف کی ایک حدیث میں آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"انکم سترون ربکم عیاناً"[2] یعنی تم اپنے رب کو کھلے بندوں دیکھو گے۔

امام ابوالحسن الاشعریؒ کا بھی اس معاملہ میں یہی موقف ہے جو کتاب وسنت پر مبنی ہے کہ رؤیت باری تعالیٰ قیامت میں ضرور ہوگی

دراصل معتزلہ نے "لاتدرکہ الابصار" سے جو استدلال کیا ہے وہ مبنی بر خطا ہے۔ اس لیے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ نگاہیں (ابصار) اس کا احاطہ نہیں کر پائیں گی نہ یہ کہ رؤیت یا دیدار ہی سرے سے ناممکن ہے۔ پھر یہ بھی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے جب کہا گیا کہ "لن ترانی" یعنی تم مجھ کو نہ دیکھ سکو گے، تو اس سے یہی مقصود ہے کہ کوئی بھی شخص اس دنیا میں رؤیت سے مشرف نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اس کا محل آخرت ہے یہ دنیا نہیں ہے۔

آخرت میں نہ صرف یہ کہ مومن رؤیت سے مشرف ہوں گے بلکہ قرآن حکیم میں ان کو "لقاء الٰہی" کی بھی خوشخبری سنائی گئی ہے سورۃ الکہف میں ہے۔

"فمن کان یرجوا لقاء ربہ فلیعمل عملا صالحا ولا یشرک بعبادۃ ربہ احدا"[3] یعنی تو جو شخص اپنے پروردگار سے لقاء کی امید رکھتا ہے تو اسے چاہیے کہ نیک عمل کرے۔ اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ بنائے۔

ایک دوسری جگہ اسی طرح ارشاد ربانی ہے:

"لعلکم بلقاء ربکم توقنون"[4] یعنی تاکہ تمھیں اپنے پروردگار سے ملنے کا یقین حاصل ہو اور یہ ظاہر ہے کہ رؤیت و نظر تو "لقاء" کا صرف ایک جزء ہے۔ کیونکہ "لقاء" میں نہ صرف یہ داخل ہے کہ اس ذات باری کو دیکھا جائے بلکہ اس کے حضور میں رُو برُو باریابی ہونا ہے۔

---

[1] سورۃ القیامۃ آیۃ ۲۲-۲۳ [2] بخاری شریف ج ۴ ص ۲۶۱ (کتاب التوحید باب وجوہ یومئذ ناضرۃ الی ربہا ناظرہ) [3] سورۃ الکہف آیۃ ۱۱۰ [4] سورۃ الرعد آیت ۲۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۳۔ مسئلہ اختیار

معتزلہ کے اس اعتقاد کے برعکس کہ انسان اپنے افعال میں اختیار کا مالک ہے امام الاشعریؒ کا یہ نظریہ ہے کہ ہر چیز اللہ کے ارادہ اور اس کی قدرت کے تحت ہے ہر خیر و شر خدا کی مشیت سے ہے وہ انسان کے فعل کا خالق ہے۔ اس حیثیت سے کہ اس کے اندر فعل کی قوت پیدا کرتا ہے

امام الاشعریؒ نے معتزلہ کے مسئلہ اختیار کا ابطال نظریہ کسب و استطاعت سے کیا ہے[۱]۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ جب انسان کسی فعل کا ارادہ کرتا ہے تو اس وقت استطاعت و کسب کی صلاحیتیں اس کو اس لائق بناتی ہیں کہ وہ جو کچھ کرنا چاہتا ہے کر گزرے۔ جب کہ معتزلہ کہتے ہیں کہ انسان اپنے فعل کا خالق ہے۔ امام صاحب کے نزدیک خلق اللہ کی صفت ہے اور انسان کو استطاعت سے زیادہ کسی چیز سے بہرہ مند نہیں کیا گیا۔

امام موصوف کی سیدھے سادھے الفاظ میں تعلیم یہ تھی کہ ہر فعل یا تو خدا کی طرف سے صادر ہوتا ہے یا اس کا ارتکاب کسی چیز یا شخص سے خدا کی طرف سے مقدر ہوتا ہے۔ یہ شخص چونکہ اکتساب کی قوت رکھتا ہے اس لیے وہ اس فعل کا مرتکب ہوتا ہے۔ مؤخر الذکر قسم کا فعل اولاً خدا کا فعل ہوتا ہے اور بعد میں بندے کا فعل، مثلاً: ایک شخص خط لکھنے بیٹھتا ہے تو اس کا خط لکھنے کی خواہش کرنا اس حکم ازلی کا نتیجہ ہوتا ہے کہ وہ فلاں وقت خط لکھے۔ پھر جب وہ قلم ہاتھ میں لیتا ہے تو یہ بھی ایک حکم ازلی کا نتیجہ ہے۔ پھر جب وہ خط لکھ سکتا ہے تو یہ ایک ایسا عمل ہوتا ہے جو اس کے اکتساب کی بدولت ظہور میں آیا۔

امام اشعریؒ کے مطابق، خدا نے انسان کو عقل کی قوت عطا فرمائی ہے اور اسے پسند اور ناپسند کا بھی اختیار عطا کیا ہے۔ انسان اس خدا کی عطا کردہ قوت اور اپنی پسند کے مطابق فعل کرتا ہے اس طرح اس کا یہ فعل اکتسابی ہوتا ہے۔ اب وہ ہر فعل (اچھے خواہ برے) کا خود ذمہ دار ہے۔ ”من عمل صالحًا فلنفسہ ومن اساء فعلیھا“[۲] یعنی جو نیک عمل کرتا ہے وہ اپنے نفع کے لیے اور جو شخص برا عمل کرتا ہے تو اس کا وبال اس پر ہے۔

۱ے کتاب اللمع کے صفحہ ۵۴ سے صفحہ ۶۲ تک اس کی تفصیل موجود ہے۔ ۲ے سورۃ حٰم سجدہ آیت ۴۶۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

امام اشعری مرحوم کا مسلک اس سلسلہ میں بھی وہی اعتدال و توسط کا ہے۔ معتزلہ کے نزدیک انسان افعال کا خالق و مختار ہے۔ اس کے برعکس جبریہ کا نظریہ ہے کہ بندہ میں کسی چیز کے احداث و کسب کی قوت سرے سے پائی ہی نہیں جاتی۔ امام موصوف، ان دونوں نظریات کے مقابلہ میں فرماتے کہ:

"العبد لا یقدر علی الاحداث ویقدر علی الکسب"[1] یعنی بندہ احداث پر قادر نہیں البتہ کسب کی استطاعت رکھتا ہے۔

امام صاحب کا یہ نظریہ کسب بعد میں اشعریت کی ایک خصوصیت قرار پایا[2] جس سے معتزلہ و جبریہ کا کلی طور پر ابطال ہوتا ہے چنانچہ امام موصوف کے ان تجدیدی کارناموں کی وجہ سے ان کو مجدد دین میں شمار کیا گیا ہے[3]

یہ تھا امام ابوالحسن الاشعریؒ کا مسلک و مذہب اور ان کا دینی فلسفہ۔ جس کی اساس راہ اعتدال پر رکھی گئی تھی۔ موصوف ایک طرف معتزلہ، جبریہ، حشویہ، قدریہ، شیعہ و خوارج کی ان بدعات و خرافات اور غلط عقائد کا ابطال عقلیات، سمعیات سے کرتے تھے تو دوسری طرف فقہا و محدثین اور سلف کے مسلک کو اختیار کرتے ہوئے بھی صرف نقل پر اکتفا نہیں کیا بلکہ

---

[1] تبیین کذب المفتری ص۱۴۶ [2] اردو دائرۃ المعارف اسلامیہ ج ۲ ص ۷۹۹۔

[3] حدیث شریف میں آتا ہے "ان اللہ یبعث لھذہ الامۃ علی راس کل مائۃ سنۃ من یجدد لھا دینھا"۔ (ابوداؤد باب مایذکر فی قرن المائۃ ص۵۸۹) یعنی اللہ ہر صدی کے سرے پر اس امت کے لیے ایسے شخص کو پیدا کرے گا جو اس کے لیے دین کی تجدید کرے گا اس حدیث سے واضح ہوتا ہے کہ ہر صدی میں ایسے لوگ ضرور ہوں گے جو طوفانِ جاہلیت اور ضلالت کا مقابلہ ضرور کریں گے، اور اسلام کو اس کی اصلی روح و صورت میں از سر نو قائم کرنے کی کوشش کریں گے۔ تیسری صدی ہجری میں امام ابوالحسن الاشعریؒ نے اس کام کا بیڑہ اٹھایا۔ اس لیے ان کو تیسری صدی کا مجدد کہا گیا ہے۔ امام ابن عساکرؒ لکھتے ہیں کہ "کان علی راس المائۃ الاولی عمر بن عبد العزیز وکان علی راس المائۃ الثانیہ محمد بن ادریس الشافعی وکان علی راس المائۃ الثالثۃ الاشعری"۔ (تبیین کذب المفتری ص۵۳) یعنی پہلی صدی کے مجدد حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ، دوسری صدی کے امام شافعیؒ اور تیسری صدی کے مجدد امام اشعریؒ تھے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عقائد اسلام کے اثبات کے لیے اسی استدلال سے کام لیا ہے جو عقلیت پسند اختیار کیے ہوئے تھے تاہم آپ اسلامی عقائد کے اثبات کے لیے عقلیات کے مقابلہ میں کتاب وسنۃ کو زیادہ ترجیح دیتے تھے۔ کیونکہ آپ کے نزدیک قرآن نے الہیات کے فہم وادراک کے سلسلے میں ان تمام عقلی وفکری پیمانوں کو متعین کیا ہے اور ان سے کام لیا ہے، جن کو محض سمعیات کہہ کر ٹھکرا دینا ممکن نہیں ہے۔

بلاشبہ اس طرح سے امام اشعریؒ نے دین اسلام کی زبردست خدمت کی اور سلف کے مسلک کی حفاظت کی تجدید دین اور حفاظت شریعت کے سلسلے میں آپ کی ان مساعی جمیلہ کا نتیجہ یہ نکلا کہ معتزلہ وفلاسفہ کی بڑھتی ہوئی گمراہی وضلالت کا سیلاب رُک گیا اور اس کے مقابلے میں مسلمانوں میں نیا اعتماد پیدا ہوا۔ اور اس احساس کمتری کا خاتمہ ہوا جو ان کے اندر علوم عقلیہ سے عدم واقفیت کی وجہ سے پروان چڑھا تھا۔ ان پر عقلیات کے رعب و داب کا طلسم ٹوٹ گیا۔ وہ نئے عزم اور حوصلہ اور اعتماد کے ساتھ آگے بڑھے اور معتزلہ اور ملاحدہ کے خلاف صف آراء ہوئے اور اقوال وعقائد میں ان کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور اہل سنت کے مسلک حقہ کو باطل فرقوں پر غالب کر دیا۔ بلاشبہ یہ امام اشعریؒ کا عظیم الشان کارنامہ ہے جسے امت مسلمہ کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین

مآخذ ومصادر

۱۔ الابانۃ عن اصول الدیانۃ (عربی) امام ابوالحسن اشعریؒ، حیدرآباد دکن مطبعۃ دائرۃ المعارف العثمانیہ ۱۳۶۷ھ ۱۹۴۸ء

۲۔ اردو دائرۃ المعارف اسلامیہ دانش گاہ پنجاب لاہور ۱۹۲۶ء

۳۔ اسلامی مذاہب (اردو) شیخ محمد ابوزہرہ مصری، فیصل آباد ملک سنز کارخانہ بازار۔

(ت ــ ل)

© rasailojaraid.com